

شیخ الحدیث حافظ ثناء اللہ مدنی حفظہ اللہ

کا علمی، معلوماتی اور دلچسپ انٹرویو
جو طلبہ و علما کے لیے بیش قیمت
نصائح پر مشتمل ہے۔

Last modified: 12:36 pm

خدمت دین کے لیے دوسروں کا دست نگر نہیں بننا

(انٹرویو: ضیائے حدیث، شمارہ: ۱۱ نومبر: ۲۰۱۳ء۔ از: محمد ارسلان حجازی)

ضیائے حدیث: میں سب سے پہلے آپ کا شکریہ ادا کروں گا کہ آپ نے پیرانہ سالی اور اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود ماہنامہ ضیائے حدیث کے لیے وقت دیا۔ میں آپ سے پہلا سوال یہ کرنا چاہوں گا کہ اپنے خاندانی پس منظر سے آگاہ فرمائیں، آپ کی پیدائش کب ہوئی اور والد مرحوم کیا کرتے تھے، آپ نے تعلیم کہاں سے حاصل کی؟

حافظ صاحب: بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ پاسپورٹ کے مطابق میری پیدائش ۱۹۴۰ء کی ہے۔ والدہ کی روایت کے مطابق پیدائش کی تاریخ میں ایک دو سال زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔ ہمارا اصل گاؤں کلس ہے۔ یہ لاہور سے ۲۱ میل کے فاصلے پر کھیم کرن کے قریب قصور سے ۶، ۷ میل مشرق میں واقع ہے۔ اب کلس بھارت میں ہے۔ بالکل سرحد کے قریب۔ ہم راجپوت برادری سے تعلق رکھنے والے زمیندار ہیں۔ ہمارے خاندان میں دین کا کوئی ذوق و شوق نہ تھا۔ ہمارے ایک بزرگ تھے ان کا نام تھا میاں محمود۔ ہمارے خاندان کے یہ پہلے فرد تھے جنہوں نے میر محمد (حافظ یحییٰ عزیز مرحوم میر محمدی کے گاؤں) سے دین سیکھا اور عقیدے کی اصلاح پائی۔ ہمارے آبائی گاؤں کلس سے میر محمد تقریباً ۱۵ میل دور ہے۔ اس کے بعد میاں محمود دہلی چلے گئے، وہاں بھی وہ کچھ عرصہ زیر تعلیم رہے۔ جب وہ تعلیم حاصل کر کے گاؤں واپس آئے تو یہاں انہوں نے توحید کی دعوت، عقائد کی اصلاح اور دین کی اشاعت کا کام شروع کیا۔ ہمارے گاؤں کی مسجد میں ایک پکی قبر تھی۔ لوگ اس کی پوجا کرتے تھے۔ میاں محمود کی کوش سے عقائد کی اصلاح ہونے لگی اور لوگ صحیح عقیدہ اختیار کرنے لگے اور قبر کی پوجا چھوڑ دی۔ ہمارے گاؤں کے لوگ مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کو بھی کلس میں دین کی تبلیغ اور عقائد کی اصلاح کے لیے بلایا کرتے تھے۔ ہمارے بزرگ بتاتے ہیں کہ

”ایک دفعہ مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے۔ انہوں نے صحیح دین اور عقیدہ توحید کی مثال بیان کرتے ہوئے فرمایا: ”ایک گلاس جو پانی سے لبریز ہو اگر اس میں مزید پانی ڈالو گے تو گر جائے گا اگر نکالو گے تو کم ہو جائے گا۔ اسی طرح دین میں بھی کسی قسم کی کمی بیشی کی گنجائش نہیں ہے۔“

ہمارے گاؤں میں سارے مسلمان تھے۔ علی الاعلان قربانی بھی ہوتی تھی۔ قرب و جوار کے ہندو اور سکھ ہم سے

ڈرتے تھے۔ ہمارے گاؤں میں کچھ لوگ تھے جو خود کو شاہ کہلاتے تھے۔ یہ مشرکانہ عقائد کے حامل تھے۔ ان کے ساتھ ایک مناظرہ بھی ہوا۔ ہماری طرف سے مناظرے حافظ عبدالقادر روپڑی رضی اللہ عنہ تھے۔ موضوع نماز تراویح کی رکعات کی تعداد تھا۔ اللہ نے اس مناظرے میں حافظ عبدالقادر مرحوم کو عظیم الشان فتح سے نوازا تھا۔ اس مناظرے سے عقیدہ توحید کو بہت پزیرائی ملی اور لوگ جوق در جوق مسلک حق کی طرف آئے۔

ہماری راجپوت برادری میں دین کی تعلیم کے حصول کا رجحان کم ہے۔ دین سے دور ہیں اور پڑھنے کا شوق بھی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ راجپوت برادری میں علماء کم ہیں۔ میاں محمود صاحب کے بعد ہماری برادری کے جس اہم فرد نے دین کی تعلیم حاصل کی وہ پروفیسر حافظ ثناء اللہ صاحب کے والد گرامی مولانا محمد عبداللہ کلسوی ہیں۔ یہ امر سر میں مولانا نیک محمد صاحب اور ویرو وال میں مولانا عبداللہ صاحب سے پڑھنے کے لیے گئے۔ ان کی اسناد میں نے دیکھی ہیں۔ یہ جب واپس آئے تو انھوں نے صحیح طریقے سے ہمارے گاؤں کلس میں دعوت دین کا کام شروع کیا۔ ان کا معمول تھا کہ وہ صبح روزانہ قرآن مجید کا درس دیتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد جب ہم ”سرہالی کلاں“ منتقل ہوئے تو یہاں بھی مولانا عبداللہ کا یہ معمول رہا۔

ضیائے حدیث: قیام پاکستان کے وقت جب آپ سرہالی کلاں منتقل ہوئے تو اس وقت آپ کے لیے کوئی مشکل، پریشانی یا آپ کا جانی و مالی نقصان ہوا؟

حافظ صاحب: پریشانی بہت اٹھانی پڑی، البتہ جانی نقصان نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ:

”ہمارے گاؤں کا ارد گرد کی آبادیوں پر بہت رعب تھا۔ ہمارے گاؤں اور برادری کے لوگ اس حد تک

بے خوف تھے کہ وہ ہجرت کے لیے بھی تیار نہ تھے۔ ان کو ملٹری نے آکر اٹھایا۔“

کلس سے ہجرت کر کے ہمارے بزرگ پہلے لکھنے کے منتقل ہوئے، پھر ایک دو جگہ اور شفٹ ہوئے، آخر میں سرہالی کلاں میں مستقل آباد ہو گئے۔ سرہالی کلاں میں آباد ہونے کا مشورہ ہمارے ایک ماموں نے دیا جو زمیندار تھے۔ وہ کہنے لگے: سرہالی کلاں زرعی اعتبار سے سونے کی چڑیا ہے، اس لیے یہاں آباد ہونا بہتر ہے۔ پروفیسر حافظ ثناء اللہ کے والد گرامی مولانا عبداللہ بھی سرہالی میں آ گئے۔

ضیائے حدیث: آپ اپنے بارے میں فرمائیں کہ آپ نے تعلیم کا سلسلہ کب شروع کیا؟

حافظ صاحب: میں نے پرائمری تعلیم اپنے گاؤں سرہالی کلاں میں حاصل کی۔ اس وقت پرائمری تعلیم کو بھی بہت اہم سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بعد حفظ قرآن شروع کیا۔ حفظ قرآن کی وجہ یہ بنی کہ ہمارے گاؤں میں ایک

استاد آگئے جن کا نام قاری خدا بخش تھا۔ ان کی منزل بہت پختہ تھی۔ تلفظ بھی بہت اچھا تھا۔ پورے قرآن مجید میں کوئی مشابہہ بھی ان کو نہ لگتا تھا۔

”مولانا عبد اللہ مرحوم (پروفیسر ثناء اللہ کے والد گرامی) کو وہ قاری صاحب بہت پسند آئے۔ مولانا عبد اللہ مرحوم نے فیصلہ کیا کہ راجپوت برادری کے ذہین اور اچھے افراد قرآن مجید حفظ کریں۔ اس فیصلے کے بعد سرہالی کلاں میں باقاعدہ مدرسہ شروع کیا گیا۔“

اس سے پہلے مولانا عبد اللہ اپنے طور پر ایک دو طلبہ کو دینی کتابیں پڑھایا کرتے تھے اور ساتھ زمیندار بھی کرتے تھے۔ جب حفظ کا مدرسہ بنا تو میں اس کے ابتدائی طلبہ میں سے تھا۔ حفظ قرآن مجید کے دوران بہت مراحل آئے اور مدوجزر سے گزرنا پڑا۔ وجہ یہ تھی کہ قاری خدا بخش مرحوم کہیں نکلتے نہ تھے۔ ان کے کھانے پینے کا ذوق بھی عجیب و غریب تھا۔ کھانے میں پکی ہوئی کوئی چیز بھی ان کو مشکل سے ہی پسند آتی تھی۔ ان کی اس عادت کی وجہ سے پورا گاؤں لاچار ہو گیا۔ ایک دفعہ ایسے ہوا کہ سخت گرمی کا موسم تھا، قاری صاحب کہنے لگے کہ میں نے بکرے کا گوشت کھانا ہے۔ دیہاتوں میں اس وقت بکرے کا گوشت عام نہیں ملتا تھا۔ چنانچہ میں دوپہر بجے سخت گرمی کے موسم میں اپنے گاؤں سے چلا۔ سرہالی کلاں سے للیانی ساڑھے تین میل ہے، وہاں سے گوشت خرید کر میں ایک گھنٹے میں واپس پہنچ گیا۔ جب گیا تو مجھے یاد نہیں کہ انھوں نے وہ بھی کھایا تھا یا نہیں۔

جب قاری صاحب سرہالی تشریف لائے تو بہت سے گھروں سے باری باری انکا کھانا جاتا تھا لیکن کچھ ہی عرصہ بعد سب نے ہاتھ کھڑے کر دیے۔ صرف دو گھر ایسے تھے۔ جو باقاعدگی سے ان کی خدمت کرتے رہے۔ ایک مولانا عبد اللہ کا اور دوسرا ہمارا گھر تھا۔ قاری صاحب قابل بہت تھے لیکن ان میں مستقل مزاجی نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے اکثر شاگرد بھی چھوڑ گئے۔ صرف دو طالب علم ان کے پاس رہ گئے۔ ایک میں تھا اور دوسرا میرا چچا زاد مقبول احمد۔ بہر کیف قاری صاحب جہاں بھی گئے ہم نے ان کو چھوڑا نہیں۔ وہ کبھی ہمیں لاہور لے آتے، کبھی میر محمد، کبھی کسی جگہ اور کبھی کسی جگہ۔ آخر پھر وہ سرہالی کلاں آگئے تو ہم بھی ان کے ساتھ تھے۔ قرآن مجید کی تکمیل ہم نے سرہالی کلاں میں کی۔ جب ہم نے قرآن مجید حفظ کر لیا تو اس وقت ہمارے گاؤں میں ایک بزرگ حاجی عبدالعزیز تھے، بہت نیک اور صالح انسان تھے، کہنے لگے: دینی کتابوں کی تعلیم کے لیے دونوں بچوں کو کسی مدرسے میں داخل کروادیا جائے۔

میری والدہ مرحومہ کو بھی دین کا بہت شوق تھا۔ والد کو بھی شوق تھا لیکن اس حد تک نہیں جتنا شوق والدہ کو تھا۔

چنانچہ حاجی عبدالعزیز کی تجویز پر کئی مدرسوں کے نام زیر غور آئے۔ آخر فیصلہ ہوا کہ حافظ عبداللہ محدث روپڑی کے مدرسے چوک داگراں میں داخل کروایا جائے۔ اس طرح میں اور حافظ مقبول احمد مسجد قدس چوک داگراں میں بغرض حصول تعلیم داخل ہو گئے۔ مسجد قدس اس وقت اہل علم کا مرکز تھا۔ یہ مسجد چونکہ ایک طرف ریلوے اسٹیشن کے قریب ہے دوسری طرف سلطان کی سرائے اور کراؤن بس کا اڈہ بھی اس کے قریب تھا۔ اس لیے باہر سے کوئی عالم دین لاہور آتے یا لاہور سے کسی نے جانا ہوتا تو مسجد قدس میں ضرور آتے تھے۔ ایک دفعہ ہم پڑھ رہے تھے کہ مولانا محمد یوسف کلکتوی مرحوم تشریف لائے۔ اس طرح مسجد قدس میں اکثر علماء کا آنا جانا رہتا تھا۔

ضیائے حدیث: آپ کے ساتھ اور کون کون سے طلبہ زیر تعلیم تھے؟

حافظ صاحب: مجھے اس وقت سب کے نام یاد نہیں۔ میری کلاس میں ۱۰، ۱۲ طلبہ تھے جن میں مولانا عبدالسلام کیلانی، حافظ عبدالرحمن مدنی، مولانا تاج الدین، سید حبیب الرحمن شاہ بخاری، راولپنڈی والے جو عبدالغنی شاہ مرحوم خطیب کاموکی کے رشتہ دار تھے وہ بھی ہمارے ساتھی تھے۔

مسجد قدس میں ہمارے اصل استاد حافظ عبداللہ محدث روپڑی تھے۔ وہ علم کا سمندر تھے۔ ایک دفعہ ہم پڑھ رہے تھے کہ مولانا حافظ محمد حسین روپڑی تشریف لائے۔ انھوں نے اپنے بھائی حافظ عبداللہ محدث روپڑی سے مخاطب ہو کر کہا: یہ آپ کیا کر رہے ہیں کہ ہمیشہ چھوٹی چھوٹی صرف نحو کی کتابیں ان بچوں کو پڑھاتے رہتے ہیں۔ بڑی کتابیں ان کو شروع کروائیں۔ وہ کہنے لگے میں ان کی بنیادیں مضبوط کر رہا ہوں۔ جو کتابیں میں ان کو پڑھا رہا ہوں بظاہر یہ چھوٹی کتابیں ہیں لیکن ان کو لکھنے والے بہت بڑے بڑے امام ہیں۔ اس لیے ان کی کتابوں کو چھوٹا نہ کہو۔ ایک وقت آئے گا یہ بچے بھی امام بنیں گے۔

حافظ عبداللہ روپڑی مرحوم نے ہماری بنیادیں اس حد تک مضبوط اور پختہ کیں کہ سارا سارا دن ہمیں لے کر بیٹھے رہتے اور پڑھاتے رہتے۔ ان کی عادت تھی کہ کھانا ایک وقت کھاتے تھے۔ زیادہ تر روزے رکھتے تھے۔ ان کی رہائش ماڈل ٹاؤن میں تھی۔ اس وقت میو ہسپتال کے قریب رتن چند کی سرائے تھی، وہاں سے ماڈل ٹاؤن کی بس جایا کرتی تھی۔ بس کا کرایہ چار آنے تھا۔ حافظ صاحب نے جب گھر جانا ہوتا تو کرایہ الگ رکھ لیتے تھے۔ ہم ان کو رتن چند کی سرائے تک بس پر بٹھانے کے لیے آتے تو وہ راستے میں بھی ہم سے ابواب الصرف سنتے جاتے تھے۔ جب کھانا کھاتے تب بھی پڑھاتے رہتے تھے۔ جب صبح آتے تو لیٹ بھی ہو جاتے تھے کیونکہ لوگ

ان کے گھر ماڈل ٹاؤن میں بھی مسئلے مسائل پوچھنے کے لیے جایا کرتے تھے۔ لیکن جب وہ مسجد قدس میں آ کر پڑھانے کے لیے بیٹھ جاتے تو پھر اٹھنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ ہم تھک جاتے لیکن ان پر تھکاوٹ کے کوئی آثار نہ ہوتے۔

ضیائے حدیث: محدث روپڑی رحمہ اللہ کے پڑھانے کا طریقہ کیا تھا؟

حافظ صاحب: حافظ عبد اللہ محدث روپڑی کتابیں کم پڑھاتے تھے لیکن بحث زیادہ کرتے، مسائل سے استدلال اور استنباط کرتے اور سمجھاتے تھے۔ بالخصوص صحیح بخاری انھوں نے بہت ہی محنت سے پڑھائی۔ ان کا یہ حکم تھا کہ جب تک تم تین گھنٹے صحیح بخاری کا مطالعہ نہ کر لو میرے پاس پڑھنے کے لیے نہ آیا کرو۔ بعض دفعہ ۶ گھنٹے بعض دفعہ ۷ گھنٹے تک پڑھاتے رہتے تھے۔ مجھے یاد ہے بعض دفعہ ۱۰-۱۰ گھنٹے تک پڑھاتے رہتے تھے۔

حافظ محدث روپڑی رحمہ اللہ جب صحیح بخاری پڑھاتے تو ان کی محفل میں ہم طلبہ کے علاوہ کئی علماء بھی آ کر استفادہ کرتے تھے۔ ان کے پڑھانے کا انداز بہت خوبصورت تھا۔ جو پڑھاتے بہت محنت، محبت اور یکسوئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی محفل میں بیٹھ کر دل کی دنیا بدل جاتی تھی۔

جب انھوں نے مشکوٰۃ پڑھائی تو مجھے یوں لگتا تھا جیسے یہ کتاب مجھے قرآن مجید کی طرح حفظ ہو گئی ہو۔ آج جب میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ وہ واقعتاً اپنے وقت کے محدث تھے۔ اسی زمانے میں محدث روپڑی رحمہ اللہ نے مشکوٰۃ کی شرح لکھنا شروع کی۔ جس کا نام مظہر النکاة فی شرح المشکاة تھا۔ حافظ عبد اللہ روپڑی لکھواتے تھے اور حافظ عبد القادر لکھتے تھے۔ مغرب کے بعد یہ ان کا معمول تھا۔ اس شرح میں انھوں نے وہ وہ نکات ذکر کیے ہیں جو کسی دوسری شرح میں نہیں ہیں۔

محدث روپڑی مرحوم جب مشکوٰۃ کی شرح لکھواتے تو میں بھی پاس بیٹھ کر قلمبند کر لیا کرتا تھا۔ جتنا انھوں نے لکھوایا وہ میں نے بھی خود اپنے قلم سے تحریر کر لیا۔ حافظ صاحب کی بعض کتابیں قلمی تھیں جو میرے پاس محفوظ ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب تھی ”توحید الرحمن بجواب استمداد عباد الرحمن“ حافظ عبد الوہاب اور حافظ عبد الغفار میرے شاگرد ہیں، یہ کتاب میں نے شائع کروانے کے لیے ان کو دی تھی۔ انھوں نے یہ کتاب شائع کروادی ہے۔ توحید کے موضوع پر یہ بہت لا جواب کتاب ہے۔ حافظ صاحب کی قلمی کتاب مشکوٰۃ کی شرح بھی میں نے ان کو چھپوانے کے لیے دی تھی لیکن ابھی تک انھوں نے شائع نہیں کی۔

اسی طرح قرآن مجید کے پہلے پارے کی تفسیر بھی میں نے ان کے سپرد کی ہے تاکہ چھپوا دیں جو ابھی تک معرض

التوا میں ہے۔ لَعَلَّ اللّٰهُ يُحْدِثُ بَعْدَ ذَلِكَ أَمْرًا

ضیائے حدیث: مسجد قدس میں حافظ عبداللہ روپڑی رحمہ اللہ کے علاوہ آپ کے کون کون سے استاد تھے؟

حافظ صاحب: حافظ عبداللہ مرحوم کے علاوہ مولانا عبدہ الفلاح مرحوم بھی میرے استاد تھے۔ موطا امام مالک اور جامع ترمذی کا کچھ حصہ، حجتہ اللہ البالغہ، مسلم الثبوت اور دیگر کتابیں ان سے پڑھی ہیں۔ اس دوران یہ ہوا کہ مولانا عبدہ الفلاح رحمہ اللہ اوکاڑہ چلے گئے اور حافظ عبداللہ محدث مرحوم حج پر چلے گئے۔ اس وقت زیادہ تر لوگ بذریعہ بحری جہاز حج پر جاتے تھے، اس لیے کافی وقت لگ جاتا تھا۔ حافظ صاحب کے حج پر جانے کے بعد مولانا عبدہ الفلاح رحمہ اللہ نے مجھے کہا: آپ اوکاڑہ آجاؤ۔ اس طرح چند ماہ میں اوکاڑہ رہا اور مولانا عبدہ کی علمی شخصیت سے بہت فائدہ اٹھایا۔ جب حافظ صاحب حج سے واپس آئے تو میں بھی مسجد قدس چلا گیا۔ واپس آ کر تمام کتب کی حافظ صاحب سے تکمیل کی۔ حافظ صاحب بے شمار خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ محدث بھی تھے، مبلغ بھی، مشفق استاد بھی تھے اور شیخ الحدیث بھی۔

انہوں نے اپنی زندگی قرآن و حدیث کی اشاعت کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ اشاعت حدیث کی طرف ان کی رغبت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ہم نے ”مشکوٰۃ“ کی تکمیل ان سے رات ۸ بجے کی اور صحیح مسلم کی تکمیل مولانا مجیب الرحمن (جواب امریکہ میں ہیں) سے رات ۱۲ بجے کی تھی، اس وقت گھڑیوں کا انتظام نہ تھا، نہ استاد تھکتے تھے، نہ پڑھنے والے تھکتے تھے۔ استاد بہت محنت اور جانفشانی سے پڑھایا کرتے تھے۔ اس کے بعد حافظ صاحب بیمار ہو گئے۔ پڑھانے کی مشکل پیش آنے لگی۔ ہماری فنون کی کچھ کتابیں رہتی تھیں۔

یہاں ایک دلچسپ بات یاد آئی، مولانا عبدالسلام کیلانی مرحوم بھی میرے ساتھ مسجد قدس میں زیر تعلیم تھے۔ وہ مجھ سے تقریباً دو سال پیچھے تھے۔ انہیں عبارت پڑھنے میں دقت پیش آتی تھی۔ حافظ صاحب ڈانٹتے تھے ان کے ڈانٹنے کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ وہ بعض دفعہ کان پکڑ کر کھینچتے تھے۔ ایسا وہ شاذ و نادر ہی کرتے تھے۔

مولانا عبدالسلام کیلانی کو جب عبارت پڑھنے میں دقت پیش آتی تو انہیں بسا اوقات حافظ صاحب مرحوم سے ڈانٹ پڑ جاتی تھی۔ عبدالسلام کیلانی صاحب ایک دفعہ پریشان ہو گئے، میں نے ان سے کہا: ”آپ میرے ساتھ بیٹھا کریں میں آپ کو پڑھا دیا کروں گا۔“ اس طرح ان کی عبارت پختہ ہو گئی اور اس واقعہ سے میری ان سے دوستی بھی پختہ ہو گئی۔

میرا ان سے لگاؤ اس حد تک تھا کہ جب سالانہ چھٹیاں ہوتیں تو ہم چاندی کوٹ (مولانا عبدالسلام کیلانی مرحوم

کے گاؤں) کی پرانی مسجد کی چھت پر بیٹھ کر درسی کتابیں پڑھتے اور یاد کیا کرتے تھے۔ یہ بہت خوبصورت دن تھے۔ جنھیں میں ساری زندگی بھول نہیں سکتا۔ مولانا عبدالسلام کیلانی اور میرا آپس میں بہت پیار تھا۔ وہ میرے بہت اچھے ساتھی اور دوست تھے۔ زندگی کی آخری سانسوں تک میرا اور ان کا تعلق رہا۔ لیکن اب کیلانی صاحب کے بچے مجھ سے نہیں ملتے۔ ملنے کے لیے آنا تو دور کی بات ہے فون پر بھی رابطہ نہیں کرتے۔ میں فون کر لوں تو کر لوں وہ نہیں کرتے۔

مولانا عبدالسلام میری زندگی کے ایک ساتھی تھے جو ہمیشہ مجھے یاد رہیں گے۔ نہ انھوں نے مجھے بھلایا تھا اور نہ میں ان کو مرتے دم تک بھلا سکتا ہوں۔ مدینہ یونیورسٹی میں بھی ہم دونوں اکٹھے گئے تھے۔ جب مدینہ یونیورسٹی جانے لگے تو اس وقت مسجد قدس میں ایک تقریب ہوئی تھی جس میں محدث دوراں حافظ محمد گوندلوی، مولانا مودودی، مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ اور دیگر بڑے بڑے علماء مدعو تھے جنھوں نے مدینہ یونیورسٹی میں ہمارے داخلے پر خوشی کا اظہار کیا اور ہماری کامیابی کے لیے دعائیں دیں۔

ضیائے حدیث: مدینہ یونیورسٹی میں آپ کے داخلے کا سبب کیسے بنا؟

حافظ صاحب: میں نے پہلے ذکر کیا ہے کہ حافظ عبداللہ محدث روپڑی حج پر گئے تھے اس دوران مدینہ میں انکی ملاقات شیخ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ سے ہوئی۔ شیخ ابن باز حافظ صاحب کی علمی ثقاہت سے بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے حافظ صاحب کو فتح الباری جو اپنی تعلیقات کے ساتھ چھپوائی تھی، وہ پیش کی۔

حافظ صاحب نے ”فتح الباری“ کی تعلیقات پر فی البدیہ اور بہت جامع تبصرہ کیا جسے سن کر شیخ ابن باز بہت متاثر ہوئے۔ اس کے بعد حافظ صاحب کی ملاقات شیخ محمد بن ابراہیم سے بھی ہوئی۔ شیخ محمد بن ابراہیم کے ذریعے سے محدث روپڑی کی شاہ سعود، شاہ فیصل اور دیگر سعودی زعماء سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ اس موقع پر حافظ صاحب مسجد قدس کے دو طلبہ کی مدینہ یونیورسٹی میں داخلے کی اجازت لے کر آئے تھے۔ ان طلبہ میں سے ایک میں تھا اور دوسرے مولانا عبدالسلام کیلانی تھے۔

ضیائے حدیث: آپ نے پیچھے ذکر کیا تھا کہ جب حافظ صاحب بیمار ہو گئے تو اس وقت فون کی کچھ کتابیں باقی رہ گئی تھیں، یہ فرمائیں کہ ان کتابوں کی تکمیل کیسے ہوئی؟

حافظ صاحب: ہوا یہ کہ میں اور مولانا عبدالسلام کیلانی ہم دونوں نے حافظ محدث روپڑی صاحب سے بات کی اور ان کی اجازت سے نیلا گنبد لاہور میں دیوبندی احباب کے مدرسہ جامعہ مدنیہ داخل ہو گئے۔ ہم کتابیں پڑھ

کر واپس آ جایا کرتے تھے اور اشکالات حافظ صاحب سے حل کروایا کرتے تھے۔ اور جامعہ مدنیہ کے استاد مولانا کریم اللہ صاحب فنون کی کتب کے ماہر تھے۔ ان کا تعلق صوبہ خیبر پی کے سے تھا۔ ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ وہ بڑے ذوق و شوق اور محبت سے ہمیں پڑھاتے تھے۔ ان سے ہم نے فقہ، اصول فقہ وغیرہ پڑھیں۔ نیلا گنبد میں ہی ایک اور مدرسہ جامعہ رحیمہ تھا، وہاں مولانا محبوب الہی سے فنون کی کچھ کتابیں پڑھیں۔ نئی انارکلی کے سرے کی مسجد میں ایک مدرسہ تھا وہاں سے بھی فنون کی کتب پڑھیں۔ وہاں مختصر المعانی کے دروس میں مولانا احمد شاہ کراچی بھی ہمارے ساتھ تھے۔

مدینہ یونیورسٹی جانے سے پہلے ہی میری اور مولانا عبدالسلام کیلانی کی عربی زبان پر اچھی خاصی دسترس ہو گئی تھی۔ مسجد قدس میں ایک استاد مولانا قادر بخش عربی کے بہت بڑے ماہر تھے۔ عربی زبان ہم دونوں نے ان سے سیکھی تھی۔ مولانا قادر بخش نے عربی گرائمر کے متعلق اوجز القواعد کے نام سے ایک کتاب تیار کی تھی جس کی کتابت مولانا عبدالسلام نے کی تھی۔ یہ بہت عمدہ کتاب تھی۔ اس دور میں یہ کتاب چھپی بھی تھی بعد میں نایاب ہو گئی۔ میں نے اپنے استاد مولانا عبدالجبار ملک پوری صاحب سے فارسی زبان سیکھی تھی۔ مولانا قاری عبدالحق مرحوم آف کراچی کے سر مولانا راغب رحمانی کچھ عرصہ مسجد قدس میں رہے۔ تفسیر کی کچھ کتابیں ان سے پڑھی تھیں۔

ضیائے حدیث: سفر مدینہ کے بارے میں آگاہ فرمائیں۔

حافظ صاحب: اس وقت ہوائی جہازوں پر سفر بہت کم ہوتا تھا۔ زیادہ تر سفر بحری جہاز کے ذریعے ہوتا تھا، ہمارا سفر ہوائی جہاز کے ذریعے تھا۔ میں اور مولانا عبدالسلام کیلانی بذریعہ ریل لاہور سے کراچی پہنچے۔

ہمارے ساتھ رہنمائی کے لیے مولانا حافظ عبدالقادر روپڑی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ وہ کراچی میں ایک ہفتہ ہمارے ساتھ رہے۔ جب ہم جہاز پر بیٹھ گئے تو وہ واپس آئے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس وقت کے اساتذہ اپنے شاگردوں سے کتنی محبت کرتے اور ان کا کتنا اکرام کرتے تھے۔

احترام اور اکرام کی بات آئی ہے تو آپ کو ایک واقعہ سناتا چلوں۔ گوجرانوالہ کے محلہ آبادی حاکم رائے میں (بیرسٹر عثمان ابراہیم MNA کے والد) حاجی ابراہیم انصاری مرحوم کی مسجد (جامعہ اسلامیہ) میں مولانا حافظ اسماعیل صاحب روپڑی رحمۃ اللہ علیہ جمعہ پڑھاتے تھے۔ حافظ اسماعیل چھ ماہ کے لیے بغرض تبلیغ کراچی بھی جایا کرتے تھے۔ اسی طرح نماز تراویح بھی وہ ہمیشہ کراچی میں بانی پاکستان کے مزار کے ساتھ حاجی عبدالقیوم کی بہت بڑی

کوٹھی تھی، وہاں پڑھاتے تھے۔ جب کراچی جاتے تو وہاں سے بذریعہ ہوائی جہاز جمعہ پڑھانے کے لیے لاہور اور لاہور سے براستہ سڑک گوجرانوالہ پہنچتے تھے۔ اگر کسی وجہ سے وہ گوجرانوالہ نہ پہنچ سکتے تو پھر حافظ عبد القادر ان کی جگہ جمعہ پڑھاتے تھے۔ اگر حافظ عبد القادر بھی مصروف ہوتے تو حافظ عبد اللہ محدث روپڑی جمعہ کے لیے تشریف لے جاتے تھے۔ حافظ عبد اللہ محدث روپڑی نے ایک دفعہ قصہ سنایا کہ میں گوجرانوالہ جمعہ پڑھانے گیا۔ راستے میں کچھ لیٹ ہو گیا۔ جب مسجد میں پہنچا تو دوسری اذان ہو رہی تھی اور منبر پر حافظ محمد گوندلوی رحمۃ اللہ علیہ تشریف فرما تھے۔ جب انھوں نے مجھے دیکھا تو احتراماً نیچے اتر آئے اور کہنے لگے:

”اب حافظ صاحب آچکے ہیں لہذا جمعہ وہی پڑھائیں گے۔ ان کی موجودگی میں میرا منبر پر بیٹھنا مناسب نہیں ہے۔“

اس واقعہ سے سمجھا جاسکتا ہے کہ اس وقت کے علماء اور شیوخ کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے کتنا احترام تھا۔

ضیائے حدیث: آپ نے علماء کے باہمی احترام کی بات کی ہے میں یہاں ایک سوال آپ سے پوچھنا چاہوں گا کہ علمائے روپڑ اور علمائے غزنویہ کے مولانا ثناء اللہ امرتسری سے اختلاف کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

حافظ صاحب: روپڑی خاندان علمائے غزنویہ کا شاگرد ہے۔ مولانا حافظ عبد اللہ روپڑی امام عبد الجبار غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں۔ اصل میں یہ اختلاف غزنوی خاندان کا مولانا ثناء اللہ امرتسری سے تھا جو روپڑی علماء کے گلے پڑ گیا۔ مولانا ثناء اللہ سلف کے عقائد کے خلاف اسماء و صفات و استوٰی علی العرش وغیرہ مسائل میں معتزلہ کی طرح تاویل کے قائل تھے۔ جسکی تفصیل ”الاربعین“ میں ہے اگرچہ ملک عبد العزیز بن سعود کی کوشش سے انھوں نے اس سے رجوع کر لیا تھا لیکن عملی طور پر ان کے عقائد کتابوں میں اسی طرح ہیں جس طرح پہلے تھے جن کی اصلاح ضروری ہے۔

ضیائے حدیث: میرا سوال یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد مولانا داؤد غزنوی اور مولانا اسماعیل سلفی رحمۃ اللہ علیہ نے مل کر ”مرکزی جمعیت اہل حدیث“ کے نام سے جماعت بنائی لیکن علمائے روپڑ نہ تو مرکزی جمعیت اہل حدیث کا حصہ بنے نہ اس کے ساتھ چلے، نہ ہی اسے تسلیم کیا بلکہ انھوں نے ”جماعت اہل حدیث“ کے نام سے الگ جماعت بنائی جو آج تک چلی آرہی ہے؟

حافظ صاحب: یہ سیاسی نہیں اجتہادی اختلاف تھا۔ مولانا حافظ عبد اللہ محدث روپڑی کہتے تھے کہ شرع میں صدارت نہیں امارت ہے۔ وہ کہتے تھے کہ صدارت کی بجائے امارت قائم کی جائے۔ اس سلسلہ میں حافظ

عبداللہ صاحب کا بہت زیادہ اصرار اور زور رہا۔ غالباً ۱۹۶۲ء میں دھوبی گھاٹ فیصل آباد میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کی آل پاکستان سالانہ کانفرنس ہوئی تھی وہاں بھی یہ مسئلہ اٹھایا گیا تھا اور وہاں صدر کی بجائے امیر کا عہدہ تو منظور ہو گیا لیکن نظام نہیں بدلا۔

ضیائے حدیث: حافظ صاحب! آئیں اب مدینہ کی طرف چلتے ہیں۔

حافظ صاحب: ہاں! جب کراچی سے ہم ہوائی جہاز میں سوار ہوئے تو راستے میں ہمیں ایک دیوبندی عالم دین محمد ناظم ندوی مل گئے، وہ ہمارے ساتھی بن گئے۔ میرا اور مولانا عبدالسلام کیلانی کا یہ پہلا سفر تھا، اس لیے ہم کچھ بھی نہ جانتے تھے۔ جب ہم جدہ اترے تو مولانا ناظم کا کوئی جاننے والا انھیں لینے ایئر پورٹ آیا ہوا تھا۔ رات ہم ان کے پاس رہے۔ اس کے بعد ہم عمرہ کر کے مدینہ گئے۔ مدینہ یونیورسٹی پہنچ کر شیخ ابن باز رحمہ اللہ سے ملاقات کی۔ انھیں بتایا کہ ہم پاکستان سے آئے ہیں اور حافظ صاحب کے شاگرد ہیں۔ شیخ ابن باز حافظ صاحب کا نام سن کر بہت خوش ہوئے اور ہمیں بہت قدر و منزلت سے نوازا۔ ایک اتفاق کی بات یہ ہوئی کہ ہم شیخ ابن باز کے دفتر میں جا کر بیٹھے ہی تھے کہ ناگہاں میں نے شیخ کے دفتر میں لاہور سے تعلق رکھنے والے ایک بہت بڑے قادیانی کو بیٹھے دیکھا۔ مسجد قدس کے قریب قادیانی لاہوری گروپ کا بہت بڑا مرکز ہے۔ اس قادیانی کا تعلق اس مرکز سے تھا اور اس کا نام عبداللطیف تھا۔ جب عبداللطیف نے ہمیں دیکھا تو فوراً بھاگ کھڑا ہوا۔ ہم نے شیخ سے کہا یہ مرزائی ہے اسے پکڑو! شیخ نے اس کے پیچھے فوراً آدمی دوڑایا مگر وہ مرزائی ایسے غائب ہوا کہ کچھ پتہ نہ چل سکا۔

ضیائے حدیث: کہا جاتا ہے کہ آپ اور مولانا عبدالسلام کیلانی پاکستان سے جانے والوں میں سابقون الاولون تھے؟

حافظ صاحب: ایسی بات نہیں، کچھ پاکستانی طلبہ ہم سے پہلے وہاں پہنچ چکے تھے۔ حافظ احسان الہی ظہیر بھی ان میں شامل تھے گو کہ حافظ احسان الہی ظہیر بغرض تعلیم نہیں بلکہ بغرض سیاحت گئے تھے۔ جب وہ مدینہ یونیورسٹی گئے تو وہاں اساتذہ سے ان کا تعارف ہو گیا اور ان کو داخلہ مل گیا۔ حافظ احسان الہی سے بھی پہلے جو پاکستانی طلبہ مدینہ پہنچے ان میں ڈاکٹر صہیب حسن، بشیر احمد جوہری، عبدالرحمن ناصر، یوسف کاظم اور دیگر شامل تھے۔

ضیائے حدیث: جس دور میں آپ مدینہ یونیورسٹی گئے اس دور میں یونیورسٹی کی کیا کیفیت تھی؟

حافظ صاحب: اس دور میں مدینہ یونیورسٹی میں ڈھائی تین سو طالب علم تھے اور چند ایک کمرے تھے۔ طلبہ کھانا

خود پکاتے تھے۔ ۲۰، ۲۵ اساتذہ تھے۔ عمارت بھی سادہ سی تھی۔ لیکن اہم اور نہ بھولنے والی چیز اعلیٰ تعلیمی معیار تھا۔ مدینہ یونیورسٹی کی تاسیسی مجلس میں پاکستان سے سید داؤد غزنوی اور مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کو بلایا گیا تھا۔

ضیائے حدیث: حافظ محمد گوندلوی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی تدریس کے لیے بلایا گیا تھا؟

حافظ صاحب: وہ قصہ اصل میں یہ تھا کہ شیخ البانی رحمۃ اللہ علیہ تین سال تک مدینہ یونیورسٹی میں مدرس رہے۔ شیخ البانی کو اللہ تعالیٰ نے بہت علم سے نوازا تھا۔ مدینہ یونیورسٹی میں ان کے حاسد پیدا ہو گئے جو بالائی سطح پر شیخ کے بارے میں شکایات پہنچاتے رہتے تھے۔ اس وجہ سے ایک وقت ایسا آیا کہ شیخ کو فارغ کر دیا گیا۔ اس کے بعد محسوس ہوا کہ اب یونیورسٹی میں کوئی ایسا عالم چاہیے جو شیخ البانی کے پائے کا ہو۔ اس مقصد کی خاطر ایک بہت بڑے سعودی عالم، جو اب بھی بقید حیات ہیں مگر بہت ضعیف ہو چکے ہیں اور میرے استاد بھی ہیں، عازم پاکستان ہوئے۔ وہ سب سے پہلے کراچی مدرسہ رحمانیہ پہنچے۔ وہاں اس وقت مولانا عبدالغفار حسن تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے اور عربی بھی بول سکتے تھے۔ سعودی شیخ مولانا عبدالغفار حسن سے متاثر ہوئے اور ان کا انتخاب کر لیا۔ پھر وہ پنجاب کی طرف آ گئے۔ اس وقت گوجرانوالہ میں مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمۃ اللہ علیہ کی بہت علمی شہرت تھی۔

سعودی شیخ مولانا اسماعیل سلفی سے ملے اور ان کو سعودیہ آنے کی دعوت دی۔ مولانا اسماعیل سلفی فرمانے لگے: ”میں ابھی تک جنس بازار نہیں بنا، جب میں جنس بازار بن گیا تو آپ بھی میرا بھاؤ لگانے آ جانا۔“ اس طرح مولانا اسماعیل سلفی نے جانے سے انکار کر دیا۔ مولانا سلفی رحمۃ اللہ علیہ استقامت، تقویٰ، عزیمت کا کوہِ گراں اور علم کا سمندر تھے۔ انھوں نے ساری زندگی ایک جگہ گزار دی۔ جب وہ گوجرانوالہ آئے تو بالکل نوجوان تھے۔ ان کا جنازہ بھی گوجرانوالہ سے اٹھا۔

استقامت، دلجمعی اور ساری زندگی ایک جگہ کام کرنے کے نتائج آج آپ کے سامنے ہیں۔ اس کے بعد سعودی شیخ حافظ محمد گوندلوی رحمۃ اللہ علیہ سے ملے اور بڑی کوشش کر کے انھیں سعودیہ جانے پر قائل کر لیا۔ حافظ صاحب جب مدینہ یونیورسٹی گئے تو ساتھ ان کا بیٹا مسعود بھی تھا۔ میں، مولانا عبدالسلام کیلانی اور دیگر اہل حدیث علماء و طلبہ نے ان کا استقبال کیا۔ اس کے بعد پہلا مرحلہ مکان کا تھا۔ ہم مکان کی تلاش میں لگ گئے۔ یونیورسٹی میں ہمارے ایک ساتھی تھے عبدالغفور عقیدے کے دیوبندی۔ ان کا ایک بھائی اکبر تھا، وہ عقیدے کا اچھا تھا۔ وہ دونوں پاکستانی تھے مگر وہاں کے رہائشی بن گئے تھے۔ ان کا مکان تھا ہم نے وہ مکان حافظ صاحب کے لیے پ۔

کر لیا اور ان سے درخواست کی کہ چل کر دیکھ لیں۔

حافظ محمد گوندلوی صاحب تشریف لائے اور مکان میں داخل ہوتے ہی کہنے لگے کہ ”یہاں میں نے رہائش نہیں رکھنی کیونکہ یہاں سے مجھے شیطانوں کی بدبو آتی ہے۔“ ہم متعجب ہوئے کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ جب تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ عبدالغفور اور اکبر کا والد بہت بڑا مشرک اور بدعتی تھا۔ وہ مدینہ سے بہت کم نکلا تھا۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ میں مدینہ میں ہی رہوں۔ مجھے موت آئے تو مدینہ میں آئے۔ ایک دفعہ اسے کسی اشد ضرورت کی وجہ سے پاکستان آنا پڑا۔ کراچی سے لاہور کی طرف ریل پر جا رہا تھا کہ اس کی موت ہو گئی۔ دہلی دروازے کے قرب و جوار میں اس کی قبر بن گئی اور اب غالباً اس قبر کی پوجا ہوتی ہے۔

خیر اس کے بعد ہم نے بر بضاعہ کے قریب حافظ صاحب کے لیے مکان تلاش کیا۔ میں اور کیلانی صاحب اکثر یونیورسٹی کے بعد کا وقت حافظ صاحب کے ساتھ اسی مکان میں گزارتے تھے۔ جب حافظ صاحب نے تدریسی عمل شروع کر دیا تو مولانا عبدالسلام کیلانی اور میں اکثر اوقات ان کے ساتھ رہتے تھے کہ پاکستان میں ان سے پڑھنے کا موقع نہیں ملا تو اب یہاں پڑھنا چاہیے۔ حافظ صاحب کو وہاں بلوغ المرام پڑھانے کی ذمہ داری سونپی گئی۔

حافظ گوندلوی رحمہ اللہ کہا کرتے تھے مجھے بڑی تکلیف ہے یہ پہلا سال ہے کہ میں بخاری شریف نہیں پڑھا سکا۔ میں اور مولانا عبدالسلام کیلانی نے عرض کی کہ آپ سے بخاری شریف پڑھنے کی سعادت ہم سمینا چاہتے ہیں۔ اس طرح میں اور مولانا عبدالسلام نے حافظ صاحب سے بخاری شریف پڑھنا شروع کر دی۔ سبحان اللہ! وہ کیا خوبصورت ایام تھے۔ جگہ مسجد نبوی جیسی۔ جہاں امام محمد بن اسماعیل البخاری نے صحیح بخاری تالیف کی اور معلم و مدرس حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ جیسے۔ یوں تو پاکستان میں میں دو دفعہ صحیح بخاری کی تکمیل کر چکا تھا لیکن مسجد نبوی میں بخاری شریف پڑھنے سے ایمان اور یقین کی بہاریں سمیٹیں وہ ہمیشہ یاد اور تروتازہ رہیں گی۔

حافظ صاحب نے مدینہ یونیورسٹی میں تدریس تو شروع کر دی لیکن ان کے لیے بعض مشکلات بھی وہاں پیدا ہوئی تھیں، مثلاً وہ پاکستان میں چٹائی پر بیٹھ کر پڑھانے کے عادی تھے۔ وہاں انھیں کرسی پر بیٹھ کر پڑھانا پڑتا تھا جس سے انھیں دقت ہوتی تھی۔ حافظ صاحب کی عربی پر بہت اچھی دسترس تھی۔ لیکن یونیورسٹی میں بولی جانے والی عربی زبان کے عام الفاظ سمجھنے میں انھیں مشکل پیش آتی تھی۔ اسی طرح حافظ صاحب کی گفتگو بہت عالمانہ ہوتی تھی مگر ان کے طلبہ بہت سطحی قسم کے تھے۔ یونیورسٹی کے اساتذہ بھی حافظ صاحب کی قابلیت کو نہیں پہنچتے

تھے۔ ان کی گفتگو بعض دفعہ فلسفیانہ ہوتی تھی۔

فلسفیانہ گفتگو کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر عربی استاد کہنے لگے: ”ہم نے پاکستان سے محدث لانا تھا لیکن یہ تو محدث کی بجائے فلسفی آگئے ہیں۔“

حافظ صاحب ایک سال تک وہاں رہے۔ وہاں انھوں نے ایمان کی بحث پر تقریباً ایک گھنٹہ لیکچر بھی دیا تھا اور جن لوگوں نے وہ لیکچر سنا تھا وہی جانتے ہیں کہ حافظ صاحب مرحوم کے علم کی کتنی گہرائی تھی۔ سب ہی ان کی گفتگو سے بہت متاثر ہوئے۔ حافظ صاحب کے مشہور شاگردوں میں سے ایک شاگرد تھے: محمد ابراہیم، وہ ان کے خصوصی شاگرد تھے۔ اور ان سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ وہ یونیورسٹی سے فراغت کے بعد کینیا چلے گئے۔ اور غالباً اب تک کینیا میں ہیں۔ حافظ صاحب کے لیکچر، دروس، اسباق اور تقریروں کے اکثر و بیشتر نوٹس ان کے پاس تھے۔

ضیائے حدیث: آپ وہاں کتنا عرصہ رہے ہیں اور کون کون سی کتابیں پڑھی ہیں؟

حافظ صاحب: میں وہاں تقریباً پانچ سال رہا ہوں۔ وہاں میں نے بلوغ المرام پڑھی لیکن اس طرح پڑھی کہ جس طرح پڑھنے کا حق ہے۔ پاکستان میں حافظ محدث روپڑی سے بلوغ المرام دوسرے سال میں پڑھی تھی۔ یہاں کی تدریس اور وہاں کی تدریس میں فرق ہے۔ یہاں کی تدریس علماء کے لیے سطحی طور پر کافی ہوتی ہے وہاں پڑھنے سے انسان کو مجتہدانہ بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ وہاں علماء کا طریقہ یہ ہے کہ وہ پہلے حدیث کے بارے میں آگاہ کرتے ہیں، لغوی تشریح بتاتے ہیں، جدید مسائل کی بھی تشریح کرتے ہیں۔ تدریس کا یہ انداز یہاں نہیں ہے۔

ضیائے حدیث: ”بلوغ المرام“ کے علاوہ آپ نے کون سی کتابیں پڑھی ہیں؟

حافظ صاحب: وہاں چار سال میں تو بمشکل بلوغ المرام ہی ختم ہوتی ہے۔

میں بلوغ المرام کی شرح سبل السلام پر ہی اکتفا نہیں کرتا تھا بلکہ اس وقت مسجد نبوی میں مکتبہ محمودیہ تھا، اس مکتبہ کی سب کتابیں میں نے دیکھیں۔ وہاں مجھے ایک بہت ضخیم قلمی کتاب نظر آئی جس کا نام تھا: ”بدر التمام“ یہ بلوغ المرام کی شرح ہے۔ صنعانی کی سبل السلام کی اصل بدر التمام ہے۔ سبل السلام اور بدر التمام میں مجھے کوئی فرق نظر نہ آیا۔

پھر میں نے وہاں نواب صدیق الحسن خان کی کتاب ”فتح العلام شرح بلوغ المرام“ دیکھی۔ فتح العلام، سبل السلام

کی کاپی ہے۔ میں نے اس زمانے میں زیادہ اعتبار بدرالتمام پر کیا۔ مکتبہ محمودیہ میں مجھے جو قلمی کتاب ملتی، میں کوشش کرتا کہ اسے نقل کر لوں۔ وہاں ایک اور قلمی کتاب تھی، جس کا نام تھا: نزہۃ الألباب فی الألقاب از حافظ ابن حجر رحمہ اللہ۔ اس وقت اس کا وہ قلمی نسخہ ہی دستیاب تھا۔ اب یہ کتاب شائع ہو چکی ہے۔ میں نے اوپر نیچے دو پیپر رکھ کر اس کتاب کے دو نسخے تیار کر لیے۔ ایک اپنے لیے اور ایک اپنے استاد محدث مدینہ الشیخ حماد الانصاری کے لیے۔

ضیائے حدیث: بخاری شریف پڑھانے کا سلسلہ آپ نے کب شروع کیا؟

حافظ صاحب: صحیح بخاری میں نے ۱۹۷۰ء میں پڑھانی شروع کی تھی۔ آغاز مسجد قدس سے کیا۔ اب تک طلبہ و طالبات کو کوئی ۴۰ دفعہ سے زائد صحیح بخاری پڑھا چکا ہوں۔

اجازۃ الروایہ محدث روپڑی رحمہ اللہ سے لی۔ سعودی عرب میں بھی متعدد شیوخ سے اجازۃ الروایہ لی۔ جامعہ سلفیہ فیصل آباد اور جامعہ رحمانیہ لاہور میں ۸ سال تک دیگر کتب کے علاوہ صحیح بخاری متعدد دفعہ پڑھائی ہے۔

ضیائے حدیث: مدینہ کی یادوں میں سے کوئی اہم واقعہ یاد ہے؟

حافظ صاحب: ایک دفعہ مدینہ میں میں اور مولانا عبدالسلام کیلانی حافظ احسان الہی ظہیر کے گھر جمع ہوئے۔ حافظ احسان الہی کے تذکرے سے یاد آیا کہ حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ کی بیٹی سے حافظ احسان الہی کا رشتہ غالباً مدینہ میں طے ہوا تھا۔ اس وقت حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ بھی مدینہ میں تھے۔ پاکستان سے حافظ احسان الہی کے والد مدینہ گئے تھے۔ ہاں تو میں بات کر رہا تھا کہ جب

ہم تینوں دوست حافظ احسان الہی کے گھر جمع ہوئے تو ہم نے مستقبل کے حوالے سے کچھ پروگرام بنائے اور کچھ ارادے وضع کیے کہ عملی زندگی میں ہم نے کیا کرنا ہے۔ پہلا ارادہ ہم نے یہ کیا کہ کسی ایک فن میں جس میں ہمارا ذہن چلتا ہے مہارت تامہ حاصل کرنی ہے۔ اپنی ساری صلاحیتیں اس میں صرف کر دینی ہیں۔ سب سے پہلے حافظ احسان الہی بولے، کہنے لگے: میں نے فرق باطلہ کی خبر لینی ہے اور ان کا رد کرنا ہے۔ اس کے بعد میں گویا ہوا کہ میرا رجحان مسائل کی طرف ہے۔ میرے استاد محدث روپڑی رحمہ اللہ تھے۔ ان کا رجحان بھی اس طرف تھا۔ اس لیے میں مسائل پر کام کروں گا۔ میرا انداز بھی تقریباً وہی ہے جو محدث روپڑی کا تھا۔ مولانا عبدالسلام کیلانی رحمہ اللہ نے بھی اپنے مستقبل کے ارادوں کے بارے میں بات کی۔ مدینہ منورہ میں بیٹھ کر ہم نے جو فیصلہ کیا تھا اور جس جس ساتھی نے جو ارادہ کیا اس کے مطابق ہم نے کام شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ایک اہم

فیصلہ ہم نے یہ کیا کہ دین کی خدمت کرنی ہے اپنے قدموں پر کھڑے ہو کر کسی کا دست نگر نہیں بننا۔ حافظ احسان الہی ظہیر کا مولانا اسماعیل سلفی رحمۃ اللہ علیہ سے بہت رابطہ اور تعلق تھا۔ ان کے مدینہ یونیورسٹی میں ابھی دو سال باقی تھے، ایک دن کہنے لگے: میرا دل چاہتا ہے میں فی الفور پاکستان چلا جاؤ اور جو مولانا اسماعیل چاہتے ہیں اس کے مطابق کام کروں۔ لیکن بہر حال انھوں نے اپنی تعلیم ادھوری نہیں چھوڑی۔ بہت اچھا کیا جو پہلے اپنی تعلیم مکمل کی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب حافظ احسان الہی واپس آئے تو اس کے بعد جو کام انھوں نے کیے دنیا ان کی معترف ہے۔ آج کے طلبہ کو میں یہی نصیحت کرنا چاہتا ہوں کہ وہ پہلے اپنی تعلیم مکمل کریں بعد میں کچھ اور کریں۔

حافظ احسان الہی ظہیر کے تذکرہ سے ایک بات یاد آئی۔ حافظ صاحب اہل حدیث کے بہت والا و شیدا اور فریفتہ تھے۔ مدینہ یونیورسٹی کے زمانہ طالب علمی میں ہی ان کا حلقہ احباب بہت وسیع ہو چکا تھا۔ ان کے حلقہ احباب میں تمام مکاتب فکر کے لوگ تھے۔ اس کے باوجود حافظ صاحب قاطع شرک و بدعت تھے۔ ایک دفعہ پاکستان سے تمام مکاتب فکر پر مشتمل علماء کا ایک وفد سعودی عرب گیا۔ وفد میں جامعہ حزب الاحناف لاہور کے مہتمم مولانا محمود احمد رضوی بھی تھے۔ وفد کی امام کعبہ سے ملاقات تھی۔ اور تعارف کا فریضہ حافظ احسان الہی کے ذمہ تھا۔ دورانِ تعارف جب مولانا محمود رضوی کی باری آئی تو حافظ صاحب ان کی طرف اشارہ کر کے بڑے دنگ لہجہ میں کہنے لگے: ”ہذا قبوری“ (یہ قبر پرست ہیں) مولانا رضوی حافظ صاحب کی بات سن کر سہم گئے۔ الغرض! حافظ احسان الہی ظہیر حق کہنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔

ضیائے حدیث: آپ جماعتی سرگرمیوں سے ساری زندگی الگ تھلگ رہے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟

حافظ صاحب: میں سمجھتا ہوں کہ جماعتی سرگرمیوں میں پڑنے سے علم کا نقصان ہوتا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ علمی کام کیا جائے تاکہ آثار باقی رہ جائیں۔

میں نے ایک دفعہ ارادہ کیا تھا کہ ”مجلس کبار العلماء اہل حدیث پاکستان“ کے نام سے کبار علماء پر مشتمل ایک مجلس بنائیں تاکہ معاشرے کو جو جدید قسم کے مسائل درپیش ہیں وہ حل کیے جائیں۔ دوسرے تمام مسالک کے کبار علماء کی ایسی مجلسیں موجود ہیں۔ اہل حدیث علماء کی ایسی کوئی مجلس نہیں۔ اس مقصد کی خاطر جید اہل حدیث علماء کا ایک اجلاس کوٹ عبدالمالک (لاہور) میں طلب کیا گیا جس میں کراچی سے پشاور تک کے ۴۰ کے قریب علماء شریک ہوئے تھے۔ مجلس بلانے کا مقصد یہ تھا کہ جید علماء کی راہنمائی میں کام کریں۔ مجلس میں جتنے علماء بھی

موجود تھے سب نے مجھے آگے کر دیا۔ علماء کے اصرار پر میں نے ذمہ داری قبول کر لی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ سب میرا ساتھ دیں گے۔ میں نے اپنے ساتھ حافظ عبدالشکور صاحب کو مجلس کے سیکرٹری کے طور پر رکھا اور ان سے کہا کہ آپ علماء کو یہ یہ جدید مسائل بھیجیں لیکن کسی عالم دین کی طرف سے بھی جواب نہ آیا۔ جامعہ سلفیہ میں کچھ سوالات بھیجے۔ انھوں نے اول تو جواب ہی نہ دیے جو دیے وہ بھی دوسطروں پر مشتمل تھے۔ مولانا ارشاد الحق اثری ویسے ہی خاموش ہو گئے۔ وہ دل سے نہیں چاہتے تھے کہ یہ مجلس بنے۔ وہ مجلس میں شریک بھی تھے مگر آگے بڑھنے، ذمہ داری اٹھانے اور کام کرنے کے لیے بھی تیار نہ تھے، حالانکہ مولانا ارشاد الحق میرے بہت اچھے اور مخلص ساتھی ہیں۔ امریکہ کے پہلے سفر میں وہ ہمارے ساتھ تھے۔ بہر حال علماء کے عدم تعاون کی وجہ سے یہ مجلس ناکام ہو گئی۔

ضیائے حدیث: حافظ صاحب! آپ نے کن کن ممالک کے سفر کیے ہیں؟

حافظ صاحب: امریکہ، مشرق وسطیٰ اور یورپ سمیت بہت سے ملکوں کے سفر کیے ہیں۔ حافظ مقبول احمد میرے حفظ کے ساتھی تھے، ان کا ذکر میں پہلے بھی کر چکا ہوں۔ وہ اس وقت دبئی گئے تھے جب ابھی وہاں ریت کے ٹیلے اور صحرا تھے اور جدید دبئی کا خواب ابھی دور تھا۔ وہ مکتب الدعوة والارشاد سعودیہ کی طرف سے وہاں مبعوث تھے۔ ان کے مدیر کا نام تھا شیخ عمر عثمان۔ بہت اچھے انسان، موحد اور دیندار تھے۔ بہت مخلص اور توحید والے تھے۔ شیخ عمر عثمان کے فضل، علم اور تقویٰ کی وجہ سے ہر جگہ ان کی عزت تھی۔ ان کے دور میں پاکستان کے بدعتی علماء کا داخلہ دبئی شارجہ وغیرہ میں قطعی ممنوع تھا۔

امارات میں میں نے کچھ وقت گزارا ہے۔ اللہ کے فضل سے امارات کے تمام خطوں اور علاقوں میں رات دن دعوت و تبلیغ کا کام کیا ہے۔ اس زمانے میں ہمارے ساتھیوں میں سے حافظ مقبول صاحب کے علاوہ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس دور میں بعض ریاستوں کے حکومتی عمائدین سے بھی بغرض دعوت و تبلیغ ملاقاتیں رہیں۔ اس کے بعد ہمارے بعض ساتھیوں نے ترغیب دلائی کہ میری لینڈ میں دعوت و تبلیغ اور پیش آمدہ جدید مسائل میں رہنمائی کی سخت ضرورت ہے۔ وہاں اس مقصد کی خاطر ایک مجلس بنائی جائے۔ ہم نے اپنے ساتھ مولانا ارشاد الحق اثری صاحب کو بھی تیار کیا مجلس کا تاسیسی اجلاس اکتوبر ۲۰۰۰ کو واشنگٹن کے ایک فائیو سٹار ہوٹل میں ہوا۔ مجلس میں پاکستان، مشرق وسطیٰ اور دیگر خطوں کے جید علماء شریک ہوئے۔ سب کی متفقہ رائے سے مجلس کے رئیس قطر سے تعلق رکھنے والے شیخ علی السلوس بنائے گئے۔ ان کے نائب تھے وہبہ الذحیلی۔ یہ بہت بڑے عالم ہیں اور

دمشق کے رہنے والے ہیں۔ مجلس کا نام مجلس فقہاء الشریعہ تجویز کیا گیا۔ یہ مجلس ۵۰ علماء پر مشتمل تھی جس میں میں اور مولانا ارشاد الحق اثری صاحب بھی شامل تھے۔ پہلے اس مجلس کے سالانہ اجلاس زیادہ تر امریکہ میں ہوئے۔ ۹/۱۱ کے بعد جب امریکہ میں مشکلات پیش آنے لگیں تو اب اس کے اجلاس مشرق وسطیٰ وغیرہ کے ممالک میں ہوتے ہیں۔ امریکہ کے سفر کے دوران حافظ عبدالوحید صاحب، جو ہوسٹن میں دارالسلام برانچ کے انچارج ہیں، ان سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

امریکہ میں میرے سینکڑوں شاگرد ہیں جو اللہ کے فضل و کرم سے وہاں بھرپور طریقے سے دعوت و تبلیغ کا کام کر رہے ہیں۔ امریکہ کے سفر کے دوران ہی میرے بہت سے شاگردوں نے مجھ سے اجازۃ الروایہ لی۔ میں آپ کو ایک اہم واقعہ سناتا ہوں۔ مجلس فقہاء الشریعہ کی تیسری سالانہ مجلس امریکہ کے شہر ہوسٹن میں تھی۔ میں بھی اس مجلس میں شریک تھا۔ فراغت کے بعد میں نے سعودیہ کا سفر کرنا تھا۔ اس لیے کہ حج کے دن قریب تھے۔ پہلے میں لندن گیا۔ لندن سے میں نے جدہ جانا تھا اور حج بالکل قریب تھا۔ جدہ سے ریاض اور ریاض سے مکہ پہنچا۔ مکہ میں کچھ دوستوں کے پاس اپنا سامان رکھوایا۔ کرنسی اپنے حزام (بیلٹ) میں اپنے پاس رکھ لی تاکہ محفوظ رہے۔ کرنسی میں امریکی ڈالر، سعودی ریال اور پاکستانی روپے شامل تھے۔ آدمی رات کا وقت تھا، میں جہاز پر تھا کہ میرے پیسے گر گئے۔ میں نے انا اللہ پڑھا اور اللہ سے دعا بھی کی۔ یا اللہ! آسانی کر دے۔ حج سے فارغ ہو کر میں ریاض چلا گیا۔

دوسرے دن مجھے جدہ سے فون آیا۔ فون کرنے والا کہہ رہا تھا آپ کی گم شدہ رقم میرے پاس ہے۔ آپ وہ حاصل کر لیں۔ اس نے مجھے اپنا ایڈریس لکھوا دیا۔ ریاض میں میرے بہت سے شاگرد ہیں۔ ان میں سے ایک عبدالستار قاسم ہے، اس کو میں نے فون کیا تو وہ جدہ چلا گیا۔ امانت کی نشانیاں بتانے پر امانت لے لی۔ جب وہ میرے پاس آیا تو میں نے دیکھا اللہ کے فضل سے اس میں سے کچھ بھی کم نہ تھا۔ سبحان اللہ! حج کے موقع پر گمشدہ رقم کا اس طرح واپس مل جانا خاص اللہ کا فضل و کرم تھا اور قرآن و حدیث کی خدمت کا نتیجہ تھا۔

ضیائے حدیث: آپ کی پسندیدہ کتب کون سی ہیں؟

حافظ صاحب: ”فتح الباری“ میری پسندیدہ کتاب ہے اس کا میں نے اتنا مطالعہ کیا ہے کہ جیسے مجھے حفظ ہو چکی ہے۔ ”فتح الباری“ میں وہ مسائل ذکر ہوئے ہیں کہ جو عام کتابوں میں نہیں ہیں۔

اس کتاب سے جب بھی کوئی مسئلہ تلاش کرنا ہو مجھے فہرست دیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جس طرح مجھے قرآن

یاد ہے اس طرح میں فتح الباری سے حدیثیں نکال لیتا ہوں۔ جب ضرورت پڑے ساتھ عمدة القاری بھی رکھ لیتا ہوں۔ سنن ابی داؤد جامعہ سلفیہ میں سات سال پڑھائی ہے۔ الشیخ منیر قمر وغیرہ میرے شاگرد ہیں۔ میرے خصوصی شاگرد قاری ابراہیم میر محمدی ہیں۔ وہ اکثر فون کر کے میرا حال پوچھتے رہتے ہیں۔ قاری ابراہیم نے مجھ سے ابو داؤد پڑھی ہے۔ جتنی پڑھی ہے وہ ساتھ نوٹ بھی کی ہے۔

تفاسیر میں سے تفسیر معالم التنزیل میرے زیر مطالعہ رہتی ہے۔ یہ بہت اچھی تفسیر ہے اور سلف کے عقیدے پر ہے۔ حافظ محمد لکھوی رحمہ اللہ نے جو شعری تفسیر لکھی ہے۔ ان کا اعتماد تفسیر معالم التنزیل پر ہے۔

یہی وجہ ہے ان کے عقیدے میں جھول نہیں ہے۔ بالخصوص استواء علی العرش کے مسائل بالکل صحیح ہیں۔ تفسیر طبری کے ساتھ بھی میرا بہت تعلق ہے۔ جامع ترمذی بھی میری پسندیدہ کتب میں شامل ہے۔ کیونکہ اس میں مذاہب کا بیان ہے اور میرا ذوق بھی مذاہب کا ہے۔ اس میں رائج مرجوح کے مسائل بھی ہیں۔

ضیائے حدیث: حافظ صاحب! اپنی تصنیف و تالیف کے بارے میں ضیائے حدیث کے قارئین کو آگاہ فرمائیں؟

حافظ صاحب: اب طبیعت میں اضمحلال آ گیا ہے، اس لیے تدریس مشکل ہو گئی ہے اور اسی وجہ سے میں نے تصنیف و تالیف کا کام شروع کر دیا ہے جائزۃ الاحوذی کے نام سے میں نے ترمذی کی شرح لکھی ہے۔

جائزۃ الاحوذی کے لکھنے کا جب ارادہ کیا تو اس کی فہرست مولانا عبدالسلام کیلانی رحمہ اللہ نے مرتب کی تھی۔ میری ایک کتاب شرح علل الترمذی ہے، ایک کتاب الوسائل فی شرح الشماک، کافی ضخیم کتاب ہے۔ طویل عرصہ سے میرا فتاویٰ بالخصوص ہفت روزہ الاعتصام میں چھپتا رہا ہے اور اس کی ایک جلد تقریباً نو سو صفحات پر مشتمل ہے جس کا نام فتاویٰ ثنائیہ مدنیہ ہے اور بازار میں دستیاب ہے اس کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں بہت سارے جدید مسائل پر بحث ہے۔ شاید دوسرے فتاویٰ میں دستیاب نہ ہو سکے۔ دوسری جلد تیاری کے مراحل میں ہے جس میں کتاب الصلوٰۃ کے مسائل بہت تفصیل سے ہیں اور تیسری اس کے بعد آئے گی۔ ان شاء اللہ

ضیائے حدیث: آپ نے ایک لمبا عرصہ تعلیم و تدریس میں گزارا ہے۔ یہ فرمائیں کہ اچھے استاد کے لیے تدریس کا کیا طریقہ ہونا چاہیے؟

حافظ صاحب: استاد نے جو کتاب پڑھانی ہے وہ پہلے خود اس کی تیاری کرے۔ ہمارے شیخ حافظ محدث

روپڑی رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے۔ ”استاد کو پڑھانے والے شاگرد ہوتے ہیں۔“

جب محدث روپڑی یہ بات فرماتے تو مولانا عبدالسلام کیلانی کبھی کبھی کہتے: شیخ صاحب! اس کا مطلب ہے کہ

ہم آپ کے استاد ٹھہرے۔“ محدث روپڑی یہ بات سن کر ہنس پڑتے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ استاد کو پہلے خود تیاری کرنی چاہیے۔ جو استاد پہلے خود تیاری نہیں کرتا وہ مسند معلّٰی پر بیٹھنے کے لائق نہیں اور تدریس میں ناکام ہے۔ استاد کو چاہیے کہ پہلے خود مطالعہ کرے اگر اسے کوئی مسئلہ سمجھنے میں مشکل درپیش ہو تو اپنے سینیئر سے پوچھے۔

ضیائے حدیث: طلبہ کے لیے آپ کیا نصیحت فرمائیں گے؟

حافظ صاحب: طالب علم کے لیے پہلی بات یہ ہے کہ وہ اپنی نیت خالص کرے، خود کو اللہ کے لیے وقف کر دے۔ یہ ارادہ رکھے کہ اللہ کی رضا کے لیے پڑھنا ہے ملازمت کے لیے نہیں۔ آج کل علم کے حصول کا مطلب ملازمت ہے کہ کسی سکول میں مدرس لگ جاؤں۔

دینی طلبہ کے سکولوں میں ملازمت کی طرف بڑھتے ہوئے رجحان کی وجہ غالباً ہماری جماعتی کوتاہی ہے۔ جماعت کا نظم نہیں اور جو طلباء تکمیل علم کے بعد فارغ ہوتے ہیں ان کے لیے کوئی پروگرام نہیں۔ جن جماعتوں میں نظم و نسق ہے وہاں یہ صورت حال نہیں۔ ہماری حالت یہ ہے کہ ہمارے لوگ تنگ آ کر دوسری جماعتوں میں چلے جاتے ہیں۔ جو عہدوں پر براجمان ہیں وہ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ ایک واقعہ آپ کو سناؤں۔ جب میں مدینہ یونیورسٹی سے فارغ ہو کر آیا تو چند دنوں بعد میں ماموں کا نجن کانسٹنٹس میں چلا گیا۔ وہاں مولانا معین الدین لکھوی رحمہ اللہ سے ملاقات ہوئی۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ میں مدینہ یونیورسٹی کا فارغ التحصیل ہوں تو خوش بھی ہوئے اور ساتھ یہ بھی فرمایا: ایک مدینہ یونیورسٹی سے فارغ ہو کر آیا ہے اور ہمارے لیے مصیبت بنا ہوا ہے۔ آپ ایسے نہ کریں جیسے وہ کر رہا ہے۔“ ان کا اشارہ حافظ احسان الہی ظہیر کی طرف تھا۔ حافظ احسان الہی ظہیر رحمہ اللہ بم دھماکہ سے پہلے ایک دفعہ میرے گھر آئے، کافی دیر تک میرے پاس رہے۔ مدینہ کی یادوں کو ہم نے خوب تازہ کیا۔ پھر کہنے لگے:

”حافظ صاحب! ہم نے ایک منظم اور متحرک جماعتی پلیٹ فارم قائم کر دیا ہے۔ آپ بھی ہمارے ساتھ آئیں اور کام کریں۔“ میں نے کہا: علامہ صاحب! سیاست آپ کا ہی میدان ہے اور آپ کو ہی چجتا ہے۔ میں تدریس، تصنیف و تالیف کا آدمی ہوں۔ بہر حال علامہ صاحب ساتھیوں سے بہت محبت اور پیار کرتے تھے اور دوستانہ تعلق ہمیشہ قائم رکھتے تھے۔

ضیائے حدیث: علماء کے لیے کیا نصیحت ہے؟

حافظ صاحب: علماء کے لیے یہی نصیحت ہے کہ جو کچھ پڑھا ہے اس پر عمل کریں۔ اگر عمل کریں گے تو سب کچھ صحیح ہو جائے گا۔ اگر عمل نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ عمل کے بغیر علم وبال ہے۔

ضیائے حدیث: حافظ صاحب! کیا آپ کی مولانا داؤد غزنوی اور مولانا اسماعیل سلفی رحمہ اللہ سے ملاقاتیں ہوئی ہیں؟

حافظ صاحب: مسجد قدس میں جب ہم زیر تعلیم تھے تو حافظ عبد القادر صاحب رحمہ اللہ اکثر جلسوں پر چلے جایا کرتے تھے۔ کھانا اس وقت پکتا جب وہ جلسے سے واپس آتے تھے۔ اگر وہ سارا دن تشریف نہ لاتے تو کھانا بھی نہ پکتا۔ انکے جلسوں پر چلے جانے کی وجہ سے ہمارے اسباق کے بہت ناغے ہو جاتے تھے۔ ہمیں کھانے کی زیادہ تکلیف نہ تھی۔ اس لیے کہ اس وقت کے طلباء کی پہلی ترجیح تعلیم ہوتی تھی۔ اگر تعلیم کا نظام صحیح ہوتا تو وہ خوش رہتے تھے۔ میں نے اپنے دوست سے مشورہ کیا (ہنتے ہوئے) آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ دوست کون تھے..... مولانا عبدالسلام کیلانی، ہم دونوں مولانا داؤد غزنوی رحمہ اللہ کے پاس ان کے مدرسہ دارالعلوم تقویۃ الاسلام چلے گئے۔ اور ان سے عرض کی کہ مسجد قدس میں ہماری پڑھائی کا بہت حرج ہو رہا ہے۔ لہذا ہم آپ کے پاس بغرض تعلیم داخل ہونا چاہتے ہیں۔ مولانا داؤد غزنوی رحمہ اللہ فرمانے لگے: ”آ جاؤ! جب ہم مسجد قدس واپس پہنچے تو ضمیر نے اجازت نہ دی کہ مدرسہ بدلیں۔ اس واقعہ کے چند دن بعد مولانا محمد حسین روپڑی رحمہ اللہ فوت وہ گئے تو ان کی تعزیت کے لیے مولانا داؤد غزنوی رحمہ اللہ ماڈل ٹاؤن تشریف لائے۔ حافظ محمد حسین رحمہ اللہ کے گھر کے سامنے شیشم (ٹاہلی) کا درخت تھا۔ وہ اس کے نیچے بیٹھے تھے۔ بڑے حافظ صاحب بھی بیٹھے تھے۔ مولانا داؤد غزنوی رحمہ اللہ بیٹھے بیٹھے اچانک ہی بڑے حافظ صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگے: آپ کے کچھ طالب علم ہمارے پاس داخلے کے لیے آئے تھے لیکن دوبارہ نہیں آئے۔ مولانا سلیمان کیلانی، مولانا اسماعیل سلفی رحمہ اللہ کے شاگرد تھے۔ مولانا عبدالسلام کیلانی مولانا سلیمان کیلانی سے ملنے جب گوجرانوالہ جاتے تو وہ مولانا اسماعیل سلفی رحمہ اللہ سے مستفید ہوتے تھے۔ اور ایک دفعہ میں مولانا اسماعیل سلفی رحمہ اللہ سے ملنے گوجرانوالہ گیا تو وہ عام چار پائی پر بیٹھے مسجد کے کونے میں عمدۃ القاری کا مطالعہ کر رہے تھے۔

ضیائے حدیث: حافظ صاحب کئی دفعہ ذہن میں ایک بات آتی ہے کہ لاہور میں غزنوی اور روپڑی خاندان دو بہت بڑے علمی خاندان تھے۔ سیالکوٹ میں مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی جیسی عظیم علمی شخصیت تھی۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ گوجرانوالہ میں اہل توحید کی تعداد میں جو اضافہ ہوا وہ لاہور میں ہو سکا نہ سیالکوٹ میں؟ آپ کیا سمجھتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟

حافظ صاحب: میں سمجھتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا اسماعیل سلفی جس جگہ گوجرانوالہ میں پہلے دن بیٹھے وہاں انھوں نے ساری زندگی گزار دی۔ تنگی ترشی آئی سب برداشت کیا، صبر سے کام لیا، اپنی اولاد کو بھی دین کے کام میں لگایا۔ ان کے بیٹے حکیم محمود نے مطب کے ساتھ ساتھ ساری زندگی دین کی بھی خدمت کی۔ اب حکیم محمود کے بیٹے حافظ اسعد محمود بھی دین کی تبلیغ و اشاعت کا کام کر رہے ہیں۔ اس کیے برعکس غزنوی خاندان قیام پاکستان کے وقت پاکستان آیا۔ مولانا داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں آ کر جو کام کیا سو کیا، اس کے بعد ان کے بیٹے سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد یہ سلسلہ رک گیا۔ یہی حال روپڑی خاندان کا ہے۔ ان کے بیٹے اب دنیا داری میں پڑ گئے ہیں۔ اب اگر تھوڑا بہت کام ہے تو حافظ عبدالرحمن مدنی کے بیٹے کر رہے ہیں۔ لیکن ان میں بھی علم کی وہ پختگی نہیں جو ان کے اسلاف کا خاصہ تھی۔ مدنی صاحب کی بیگم بھی میری شاگردہ ہیں۔ وہ مولانا عبدالرحمن کیلانی کی بیٹی ہیں۔ ہم تینوں نے علامہ وحید الزماں کی بخاری شریف کے ترجمہ پر کام کیا ہے۔ اس ترجمہ میں عقیدے کی اور دوسری بہت سی غلطیاں ہیں۔ ہم تینوں نے کتاب میں غلطیوں کی اصلاح اور مسائل کی وضاحت کی ہے۔ کتاب الجنائز کے آخر تک ہم نے یہ کام کیا ہے جو موجود ہے۔ لیکن بہر حال علم کی پختگی کی اہمیت اپنی جگہ ہے۔ علماء میں علم کی پختگی ضرور ہونی چاہیے۔ ایک بات یاد آئی وہ یہ ہے کہ اس وقت ایک فتنہ وباء کی طرح پھیل چکا ہے۔ یہ ڈاکٹری (P.H.D) کا فتنہ ہے۔ ڈاکٹر کیسے بنتے ہیں؟ لوگوں کو رکھ لیتے ہیں، محنت وہ کرتے ہیں، کتابیں وہ لکھتے ہیں۔ نام ان کا چلتا ہے اور ڈاکٹر بن جاتے ہیں۔ اکثر اس طرح ہوتا ہے۔ الا ماشاء اللہ

ضیائے حدیث: حافظ صاحب! آپ کی کون سی خواہشات ہیں جو تشنہ تکمیل ہیں؟

حافظ صاحب: میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ میری اولاد میرے نقش قدم پر چلے۔

میری اولاد میں سے میرا سب سے چھوٹا بیٹا میرے نقش قدم پر ہے۔ اس نے صحیح بخاری مجھ سے پڑھی ہے اور ہمارے گاؤں کی مسجد میں جمعہ بھی وہی پڑھاتا ہے۔ میری والدہ کی نصیحت تھی کہ جمعہ گاؤں میں پڑھانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے ساری زندگی اپنا گاؤں نہیں چھوڑا۔

میں نے جامعہ سلفیہ فیصل آباد میں ۸ سال پڑھایا ہے۔ لیکن والدہ مرحومہ کی نصیحت کے مطابق ۸ سال مسلسل جمعہ اپنے گاؤں میں آ کر پڑھاتا رہا ہوں۔

جمعہ پڑھانے کے بعد گاؤں سے رات کے وقت فیصل آباد جایا کرتا تھا۔ اب میرا چھوٹا بیٹا گاؤں میں میری جگہ

جمعہ پڑھا رہا ہے۔ میرا بڑا بیٹا بھی صاحب علم ہے۔ اس نے تمام کتابیں مجھ سے جامعہ سلفیہ میں پڑھی ہیں۔ لیکن اس کا المیہ یہ ہوا کہ وہ سکول کا ماسٹر بن گیا۔ جو سکول ماسٹر بن جائے اس کو علم کی اشاعت و تبلیغ کا وہ ذوق و شوق نہیں رہتا جو ہونا چاہیے۔ میری بڑی بیٹی گاؤں میں دین کا بہت کام کر رہی ہے۔ بہت بڑا مدرسہ ہے جس میں ۲۰۰ بچیاں زیر تعلیم ہیں، جو قرآن، تجوید، حفظ اور دینی کتابوں کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ ہمارے گاؤں میں اہل حدیث مسلک کی ۶ مسجدیں ہیں۔^۱

مگر جمعہ ایک جگہ ہوتا ہے۔ جہاں میرا بیٹا پڑھاتا ہے۔ لوگوں کا جذبہ یہ ہے کہ اگر میں چندے کا اعلان کروں تو لاکھوں روپے جمع ہو جاتے ہیں۔ باقی بیٹیاں بھی اپنی اپنی جگہ دین کا کام کر رہی ہیں۔ میری آخری اور پہلی خواہش یہی ہے کہ میری اولاد دین پر کاربند رہے۔ اگر انسان دنیا کے پیچھے لگ جائے تو دنیا فتنہ بن جاتی ہے۔ علماء میں بھی دیکھا ہے جہاں دنیا آئی وہاں سے دین رخصت ہو گیا۔ جنھوں نے دنیا کی پرواہ نہیں کی اللہ نے ان کو دنیا بھی اور دین بھی دے دیا۔ میں نے پوری زندگی میں فاقہ نہیں دیکھا۔

گاؤں میں تقریباً ۱۳۰ ایکڑ زمین ہے اور بہت اچھی گزر بسر ہو رہی ہے۔ یہ سب دین کی برکت کا نتیجہ ہے۔

ضیائے حدیث: مدارس میں تعلیم اصلاحات کے لیے آپ کی کیا تجاویز ہیں، پاکستان میں مسلک اہل حدیث کے مدارس میں طلباء کی تعداد بھی کم ہو رہی ہے اور تعلیم کا معیار بھی گرتا جا رہا ہے؟

حافظ صاحب: اصل بات یہ ہے کہ خلوص کا فقدان ہے۔ ہم میں بھی، مدرسین میں بھی اور جو مہتمم ہیں مدارس کے ان میں بھی اور طلباء میں بھی، دیگر مذاہب میں ایسا نہیں، ان کا ایک نظم ہے اس نظم کے تحت چلتے ہیں۔

ضیائے حدیث: حافظ صاحب! آپ نے فتویٰ نویسی کا کام کب شروع کیا تھا؟

حافظ صاحب: فتویٰ نویسی کا کام ہفت روزہ تنظیم اہل حدیث میں ۱۹۷۰ء کے بعد شروع کیا تھا۔ ۱۹۹۰ء کے

بعد ہفت روزہ الاعتصام میں میرے فتاویٰ چھپتے رہے ہیں۔ فتاویٰ کی جلد نمبر ۳، ۴، تیاری کے مراحل میں ہیں۔

ضیائے حدیث: مدارس میں دینی علوم کے ساتھ عصری علوم کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

حافظ صاحب: دینی علوم کے ساتھ عصری علوم نہیں ہونے چاہئیں۔ اس لیے کہ یہ فتنہ ہے۔ ہمارے زمانے میں دینی علوم کے ساتھ عصری علوم کے پڑھانے کا تصور بھی نہ تھا۔ نہ ہی استاد پڑھنے دیتے تھے۔ وہ روکتے اور کہتے تھے: ”پہلے دین پڑھو، باقی سب اس کے بعد میں ہے۔“ اور میں نے خود ایم اے عربی، و اسلامیات بعد میں کیا۔

^۱ اب ایک مسجد اور بن گئی ہے تو کل سات مساجد ہیں۔

اور مدینہ یونیورسٹی سے امتیازی حیثیت سے فارغ ہوا تھا۔ بعض مدارس میں نصاب ایسے بنائے جا رہے ہیں کہ دنیوی علوم غالب ہیں۔ اب مدنی صاحب دن رات یونیورسٹی بنانے میں لگے ہوئے ہیں اور حالت یہ ہے کہ جو مواد پہلے عربی میں پڑھایا جاتا تھا اب وہ اردو میں پڑھایا جا رہا۔ طلباء میں عربی ذوق و شوق نہیں رہا۔ یہ کوتاہی ہے البتہ اگر اصل تعلیم دین کی ہو اور دنیوی تعلیم اس کے تابع ہو پھر ٹھیک ہے۔

اگر ایک طالب علم دینی تعلیم کے ساتھ دنیوی تعلیم اس نیت سے حاصل کرے کہ دین کا کام بہتر انداز میں ہو سکے تو درست ہے۔

ایک بات یہ بھی یاد رکھیں کہ دینی مسائل میں استاد قابل ہونا چاہیے۔ جب استاد کی دینی علوم میں صحیح دسترس نہ ہوگی۔ تو وہ بچوں کو کیا تعلیم دے گا اور ان کے دلوں میں دین کا کیا شوق پیدا کرے گا۔